ہر طرف سے مایوس ہونے پر سورداس کے دل میں یکا یک یہ خیال آیا کہ اس زمین کو کیوں نہ بیچ دوں۔ اس کے سوا اب مجھے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ کہاں تک باپ دادا کے نام کو روؤں۔ صاحب اسے لینے کو منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ دام بھی اچھے دے رہے ہیں۔ انہیں کو دے دوں۔ چار پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں۔ اپنے گھر میں سیٹھ کی طرح بیٹھا ہوا چین کی بنسی بجاؤں گا۔ چار آدمی گھیرے رہیں گے۔ محلّہ میں اپنا مان ہونے لگے گا۔ یہی لوگ جو آج مجھ پر رعب جما رہے ہیں، میرا منہ تاکیں گے۔ میری خوشامد کریں گے۔ یہی ہوگا نہ محلّہ کی گائیں ماری ماری پھریں گی۔ پھریں۔ اس کو میں کیا کروں۔ جب تک نبھ سکا نبھایا۔ اب نہیں نبھ سکتا۔ جن کی گائیں چرتی ہیں کون میری بات پوچھتے ہیں۔ آج کوئی میری پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تو بھیرو مجھے رلا کر یوں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا نہ جاتا۔ جب اتنا بھی نہیں ہے تو مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے لیے مروں۔ جی ہے تو جہان ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو جیسے پر دھتکار ہے۔

سورداس یہ سوچ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا گودام کی طرف چلا۔ گودام کے سامنے پہنچا تو دیا گر سے بھینٹ ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا۔ ''ادھر کہاں چلے۔ سورداس؟ تمہاری جگہ تو پیچھے رہ گئی۔''

سورداس: ذرا انہیں میاں صاحب سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔

دیا گر: کیا اسی زمین کے بارے میں؟

سورداس: ہاں میرا ارادہ ہے کہ یہ زمین بیچ کر کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلا جاؤں۔ اس محلّہ میں اب نباہ نہیں ہے۔

دیا گر: سنا ہے آج بھیرو تمہیں مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

سورداس: میں طرح نہ دے جاتا تو اس نے مار ہی دیا ہوتا۔ سارا محلّہ بیٹھا ہنستا رہا۔ کسی کی زبان نہ کھلی کہ اندھے اپاہج آدمی پر یہ انیائے کیوں کرتے ہو۔ تو جب میرا کوئی ہتوا نہیں ہے تو میں کیوں دوسروں کے لیے مروں۔

دیا گر: نہیں سورداس۔ میں تمہیں زمین بیچنے کی صلاح نہ دوں گا۔ دھرم کا پھل اس جنم میں نہیں ملتا۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے نارائن پر بھروسہ رکھتے ہوئے دھرم کے راستے پر چلتے رہنا چاہیے۔ سچ پوچھو تو آج نارائن نے تمہارے دھرم کی پرکھا کی ہے۔ سنکٹ ہی میں دھیرج اور دھرم کی پرکھا ہوتی ہے۔ دیکھو گوسائیں جی نے کہا ہے۔

آپت کال پرکھیے چاری　　دھیرج، دھرم متر اور ناری

زمین پڑی ہے پڑی رہنے دو۔ گائیں چرتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا پن ہے! کون جانتا ہے کبھی کوئی دانی دھرماتما آدمی مل جائے تو دھرم شالہ، کنواں، مندر بنوا دے کہ مرنے پر بھی تمہارا نام امر رہے۔ رہی تیرتھ جاترا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت نہیں۔ سادھو سنت جنم بھر یہی کیا کرتے ہیں۔ پھر گھر سے روپوں کی تھیلی باندھ کر نہیں چلتے۔ میں بھی شیوراتری کے بعد بردی نارائن جانے والا ہوں۔ ہمارا تمہارا ساتھ بھی ہو جائے گا۔ راستہ میں تمہاری ایک کوڑی خرچ نہ ہوگی۔ اس کا میرا ذمہ۔

سورداس: نہیں بابا۔ اب یہ انیائے نہیں سہا جاتا۔ بھاگ میں دھرم کرنا نہیں لکھا ہوا تو کیسے دھرم کروں گا؟ ذرا ان لوگوں کو بھی تو معلوم ہو جائے کہ سورداس کوئی چیز ہے۔

دیا گر: سورداس! آنکھیں بند ہونے پر بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ اہنکار (خودی) ہے۔ اسے مٹاؤ، نہیں تو یہ جنم بھی بگڑ جائے گا۔ یہ اہنکار سب پاپوں کی جڑ ہے۔ نہ یہاں تم ہو نہ تمہاری زمین ہے۔ نہ تمہارا کوئی دوست ہے۔ نہ دشمن۔ جہاں دیکھو بھگوان ہی بھگوان ہیں۔ ان جھگڑوں میں نہ پڑو!

سورداس: بابا جی۔ جب تک بھگوان کی دیا نہ ہوگی۔ بھگتی اور بیراگ کسی پر من نہ جمے گا۔ اس گھڑی میرا دل رو رہا ہے۔ اس میں اپدیش اور گیان کی باتیں نہیں سما سکتیں۔ گیلی لکڑی کھرا دپر نہیں چڑھتی۔

دیا گر: پچھتاؤ گے اور کیا؟

یہ کہہ کر دیا گر اپنی راہ چلے گئے۔ وہ ہر روز گنگا نہانے جایا کرتے تھے۔

ان کے چلے جانے پر سورداس نے دل میں کہا۔ یہ بھی مجھی کو گیان سکھاتے ہیں۔ غریبوں پر اپدیش کا بھی داؤں چلتا ہے۔ موٹے آدمیوں کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ وہاں تو جا کر ٹھکر سوہاتی کرنے لگتے ہیں۔ مجھے گیان سکھانے چلے ہیں۔ دونوں جون بھوجن مل جاتا ہے نا۔ ایک دن نہ ملے تو سارا گیان نکل جائے۔

تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی رکاوٹوں کو پھاند جاتی ہے۔ سورداس سمجھانے سے اور بھی ضد پکڑ گیا۔ سیدھا گودام کے برآمدہ میں جا کر رکا۔ اس وقت وہاں بہت سے چمار جمع تھے۔ کھالوں کی خرید ہو رہی تھی۔ چودھری نے کہا۔ ''آؤ سورداس! کیسے چلے؟''

سورداس اتنے لوگوں کے سامنے اپنی خواہش ظاہر نہ کر سکا۔ لحاظ نے اس کی زبان بند کر دی بولا۔ ''کچھ نہیں۔ ایسے ہی چلا آیا ہوں۔''

طاہر: صاحب ان سے پیچھے والی زمین مانگتے ہیں۔ منہ مانگے دام دینے پر تیار ہیں۔ مگر یہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انہوں نے خود سمجھایا۔ میں نے کتنی منت کی، پر ان کے دل پر کوئی بات جمتی ہی نہیں۔

حیا میں نہایت بے حیائی بھی ہوتی ہے۔ آخر وقت بھی جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی الٹی سانسیں چل رہی ہیں۔ وہ ایک دم زندہ ہو جاتی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ فرض شناس۔ ہم پریشانیوں میں مبتلا ہو کر کسی دوست سے مدد مانگنے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں لیکن دوست سے آنکھیں چار ہوتے ہی حیا ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک بھی ایسا لفظ منہ سے نہیں نکلنے دیتے جس سے ہماری اندرونی تکلیف کا اظہار ہو۔

طاہر علی کی باتیں سنتے ہی سورداس کی حیا قہقہہ مارتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بولا۔ ''میاں صاحب! یہ زمین تو پرکھوں کی نشانی ہے۔ بھلا میں اسے بیچ یا پٹہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے اسے دھرم کاج کے لیے سنکلپ کر دیا ہے۔''

طاہر: دھرم کاج بغیر روپوں کے کیسے ہوگا؟ جب روپے ملیں گے جبھی تو تیرتھ کرو گے۔

سادھولوگوں کی سیوا کروگے۔ مندر اور کنواں بنواؤ گے۔

چودھری: سورداس! اس بکھت (وقت) اچھے دام ملیں گے۔ ہماری تو یہی صلاح ہے کہ دے دو۔ تمہارا اس سے کوئی لابھ تو ہوتا نہیں۔

سورداس: محلّہ بھر کی گائیں چرتی ہیں۔ کیا اس سے پن نہیں ہوتا۔ گئو کی سیوا سے بڑھ کر اور کون پن کا کام ہے۔

طاہر: اپنا پیٹ پالنے کے لیے تو بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ چلے ہو دوسروں کے ساتھ پن کرنے! جن کی گائیں چرتی ہیں وہ تو تمہاری بات بھی نہیں پوچھتے۔ احسان ماننا تو دور رہا اسی دھرم کے پیچھے تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے۔ ورنہ ٹھوکریں نہ کھاتے پھرتے۔

طاہر علی خود بڑے دین دار آدمی تھے لیکن دوسرے مذہبوں کی برائی کرنے میں ان کو ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ دراصل وہ اسلامی مذہب کے سوا اور کسی مذہب کو مذہب نہیں سمجھتے تھے۔

سورداس نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ ''میاں صاحب! دھرم احسان کے لیے نہیں کیا جاتا۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہیے۔''

طاہر: پچھتاؤ گے اور کیا۔ صاحب سے جو کچھ کہو گے، وہی کریں گے۔ تمہارے لیے گھر بنوا دیں گے۔ ماہوار وظیفہ دیں گے۔ مٹھوا کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کو بٹھا دیں گے۔ اسے نوکر رکھا دیں گے۔ تمہاری آنکھوں کی دوا کرا دیں گے۔ ممکن ہے تمہاری آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی بن جاؤ گے۔ نہیں تو دھکے کھاتے رہو گے۔

سورداس پر اور کسی ترغیب کا اثر نہ ہوا، لیکن آنکھوں کے علاج کا ذکر سن کر وہ نرم پڑا۔ بولا۔ ''کیا جنم کے اندھوں کی بھی دوا ہو سکتی ہے؟''

طاہر: تم جنم کے اندھے ہو گیا؟ جن تو مجبوری ہے، لیکن تمہاری آسائش کے اتنے سامان جمع کر دیئے جائیں گے کہ تمہیں آنکھوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

سورداس: نہیں۔ میں صاحب! اس میں بڑی ناموسی ہو گی۔ لوگ چاروں طرف سے

دھتکارنے لگیں گے۔

چودھری: تمہاری جائیداد ہے۔ بیچ کرو چاہے پٹہ لکھو۔ دوسرے کو دخل دینے کا کیا اختیار ہے۔

سورداس: باپ دادوں کا نام تو نہیں ڈبویا جاتا۔

جہلاء کے پاس دلیلیں نہیں ہوتیں۔ دلائل کا جواب وہ ضد سے دیتے ہیں۔ دلیل قائل ہوسکتی ہے۔ نرم ہوسکتی ہے۔ پر ہٹ کو کون قائل کرسکتا ہے۔

سورداس کی ہٹ سے طاہر علی کو غصہ آ گیا۔ بولے۔ ''تمہاری تقدیر میں بھیک مانگنا لکھا ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟ ان بڑے آدمیوں سے ابھی پالا نہیں پڑا ہے۔ ابھی تمہاری خوشامد کر رہے ہیں۔ معاوضہ دینے پر تیار ہیں، لیکن تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ اور وہی جب قانونی داؤں پیچ کھیل کر زمین پر قبضہ کرلیں گے۔ دو چار سو روپے برائے نام معاوضہ دے دیں گے تو پھر سیدھے ہو جاؤ گے۔ محلّہ والوں پر پھولے بیٹھے ہو۔ پر دیکھ لینا جو کوئی پاس بھی پھٹکے۔ صاحب یہ زمین لیں گے ضرور، چاہے ہنس کر دو چاہے رو کر۔''

سورداس نے متکبرانہ انداز سے جواب دیا۔ ''خان صاحب! اگر زمین جائے گی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی!''

یہ کہہ کر اس نے لکڑی سنبھالی اور اپنے اڈے پر جا بیٹھا۔

ادھر دیاگر نے جا کر نایک رام سے یہ حال کہا۔ بجرنگی بھی بیٹھا تھا۔ یہ خبر سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ سورداس کے بل پر دونوں اچھلتے رہے۔ اس دن طاہر علی سے کیسی باتیں کیں اور آج سورداس ہی نے دھوکا دیا۔ بجرنگی نے متفکر ہو کر کہا۔

''اب کیا کرنا ہوگا۔ پنڈا جی! بتاؤ۔''

نایک رام: کرنا کیا ہوگا؟ جیسا کیا ہے ویسا بھگتنا ہوگا۔ جا کر اپنی گھر والی سے پوچھو۔ اسی نے آج آگ لگائی تھی۔ جانتے تو ہو کہ سورداس مٹھوا پر جان دیتا ہے۔ پھر کیوں بھیرو کی مرمت نہیں کی؟ میں ہوتا تو کبھی بھیرو کو دو چار کھری کھوٹی سنائے

بغیر نہ جانے دیتا اور نہیں تو دکھاوے کے لیے ہی۔ اس بے چارہ کو بھی معلوم ہو جاتا کہ میری پیٹھ پر کوئی ہے۔ آج اس کو بڑا رنج ہوا ہے۔ نہیں تو زمین بیچنے کا اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

بجرنگی: ارے تو اب کوئی تدبیر سوچو گے یا بیٹھ کر پچھلی باتوں کے نام کو روئیں؟

نایک رام: تدبیر یہی ہے کہ آج سورداس آئے تو چل کر اس کے پیروں پر گرو۔ اسے دلاسا دو۔ جیسے راضی ہو راضی کرو۔ دادا بھیا کرو۔ مان جائے تو اچھا نہیں تو صاحب سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ان کا قبضہ نہ ہونے دو۔ جو کوئی زمین کے پاس جائے اس کو مار کر بھگا دو۔ میں نے تو یہی سوچ رکھا ہے۔ آج سورداس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر دودھیا پلاؤں گا اور مٹھوا کو پیٹ بھر مٹھائیاں کھلاؤں گا۔ جب نہ مانے گا تو دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ ذرا میں صاحب کے پاس کیوں نہیں چلے چلتے؟ سورداس سے اس نے نہ جانے کیا کیا باتیں کی ہوں۔ کہیں لکھا پڑھی کرانے کو کہہ آیا ہو تو پھر چاہے کتنی ہی آرزو منت کرو گے، وہ اپنی بات نہ ٹالے گا۔

نایک رام: میں ان منشی کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔ اس کا مزاج اور بھی آسمان پر چڑھ جائے گا۔

بجرنگی: نہیں! پنڈا جی۔ میری خاطر سے ذرا چلے چلو۔

نایک رام آخر راضی ہو گئے۔ دونوں آدمی طاہر علی کے پاس پہنچے۔ وہاں اس وقت سناٹا تھا۔ خریداری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ چمار چلے گئے تھے۔ طاہر علی تنہا بیٹھے ہوئے حساب کتاب لکھ رہے تھے۔ میزان میں کچھ فرق پڑتا تھا۔ بار بار جوڑتے تھے، پر غلطی پر نگاہ نہ پڑتی تھی۔ دفعتاً نایک رام نے کہا۔ ”کہیے منشی جی آج سورداس سے کیا بات چیت ہوئی؟“

طاہر: آہا۔ آیئے پنڈا جی! معاف کیجیے گا۔ میں ذرا میزان جوڑنے میں مصروف

تھا۔ اس مونڈھے پر بیٹھیے۔ سورداس سے کوئی بات طے نہ ہوگی۔ اس کی تو شامت آئی ہے۔ آج تو دھمکی دے کر گیا ہے کہ زمین کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔ غریب آدمی ہے مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ آخر یہی ہوگا کہ صاحب کسی قانون کے رو سے زمین پر قابض ہو جائیں گے۔ کچھ معاوضہ ملا تو خیر۔ ورنہ اس کی بھی امید نہیں!

نایک رام: جب سورداس راضی نہیں ہے تو صاحب کیا کھا کر یہ زمین لے لیں گے؟ دیکھ بجرنگی! ہوئی نہ وہی بات۔ سورداس ایسا کچا آدمی نہیں ہے۔

طاہر: صاحب کو ابھی آپ جانتے نہیں ہیں۔

نایک رام: میں صاحب اور صاحب کے باپ دونوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاکموں کی خوشامد کی بدولت آج بڑے آدمی بنے پھرتے ہیں۔

طاہر: خوشامد ہی کا تو آج کل زمانہ ہے۔ وہ اب اس اراضی کو لیے بغیر نہ مانیں گے۔

نایک رام: تو ادھر بھی یہی طے ہے کہ زمین پر کسی کا قبضہ نہ ہونے دیں گے۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ اس کے لیے مر مٹیں گے۔ ہمارے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔ اسی کھیت میں سب کو ٹھہرا دیتا ہوں۔ زمین نکل گئی تو کیا جاتریوں کو اپنے سر پر ٹھہراؤں گا؟ آپ صاحب سے کہہ دیجیے گا۔ یہ ان کی دال نہ گلے گی۔ یہاں بھی کچھ دم رکھتے ہیں۔ بارہویں مہینے کھلے خزانے جوا کھیلتے ہیں۔ ایک ایک دن میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ تھانہ دار سے لے کر سپرنٹنڈنٹ تک سب جانتے ہیں۔ پر مجال کیا کہ کوئی دوڑ لے کر آئے خون تک چھپا ڈالے ہیں۔

طاہر: تو آپ یہ سب باتیں مجھ سے کیوں کہتے ہیں؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں؟ آپ نے سید رضا علی تھانہ دار کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں انہیں کا لڑکا ہوں۔ یہاں کون

پنڈا ہے جس کو میں نہیں جانتا؟

نا یک رام: لیجیے گھر ہی بید تو مریے کیوں۔ پھر تو آپ اپنے گھر ہی کے آدمی ہیں۔ داروغہ جی کی طرح بھلا کیا کوئی افسر ہوگا۔ کہتے تھے۔ ''بیٹا! جو چاہے کرو لیکن میرے پنجے میں نہ آنا۔'' میرے دروازے پر بھیڑ جمتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ بالکل گھر والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کوئی بات بنی بگڑی۔ جا کر سب کی سب سنا دیتا تھا۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔ ''بس جاؤ۔ اب ہم دیکھ لیں گے۔'' ایسے آدمی اب کہاں ست جگی لوگ تھے۔ آپ تو اپنے بھائی ہی ٹھہرے۔ صاحب کو دھتا کیوں نہیں بتاتے؟ آپ کو نارائن نے علم اور عقل دی ہے۔ بیسیوں بہانے نکال سکتے ہیں۔ برسات میں پانی رکتا ہے۔ دیمک بہت ہے۔ لونی لگے گی۔ ایسے ہی اور کتنے بہانے ہیں۔

طاہر: پنڈا جی! جب آپ سے بھائی چارا ہو گیا تو کیا پروا ہے۔ صاحب پلے درجہ کا گھاگ ہے۔ حاکموں سے اس کا بڑا میل جول ہے۔ مفت میں زمین لے لے گا۔ سورداس کو تو چاہے سود و سومل بھی رہیں۔ میرا انعام اکرام غائب ہو جائے گا۔ آپ سورداس سے معاملہ طے کر دیجیے تو اس کا بھی فائدہ ہو، میرا بھی اور آپ کا بھی۔

نا یک رام: آپ کو جو یہاں سے انعام اکرام ملنے والا ہو وہ ہمیں لوگوں سے لے لیجیے۔ اسی بہانے کچھ آپ کی خدمت کریں گے۔ میں تو داروغہ جی کو سمجھتا ہوں۔ ویسا ہی آپ کو بھی سمجھتا ہوں۔

طاہر: معاذ اللہ! پنڈا جی! ایسی بات نہ کہیے۔ میں مالک کی نگاہ بچا کر ایک کوڑی لینا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی خوشی سے جو کچھ دے دیں گے میں ہاتھ پھیلا کر لے لوں گا۔ پر ان سے چھپا کر نہیں۔ خدا اس راستہ سے بچائے! والد نے اتنا کمایا، پر مرتے وقت گھر میں ایک کوڑی کفن کو بھی نہ تھی۔

نا یک رام: ارے یار! میں تمہیں رشوت تھوڑا ہی دینے کہتا ہوں۔ جب ہمارا

آپ کا بھائی چارہ ہو گیا تو ہمارا کام آپ سے نکلے گا۔ آپ کا کام ہم سے۔ یہ کوئی رشوت نہیں ہے۔

طاہر: نہیں پنڈا جی! خدا میری نیت کو پاک رکھے۔ مجھ سے نمک حرامی نہ ہو گی۔ میں جس حال میں ہوں۔ اسی میں خوش ہوں۔ جب اس کے کرم کی نگاہ ہو گی تو میری بھلائی کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

نایک رام: سنتے ہو بجرنگی! داروغہ جی کی باتیں؟ چلو چپکے سے گھر بیٹھو۔ جو کچھ آگے آئے گا۔ دیکھا جائے گا۔ اب تو صاحب ہی سے نبٹنا ہے۔

بجرنگی کے خیال میں نایک رام نے اتنی منت سماجت نہ کی تھی، جتنی کرنی چاہیے تھی۔ آئے تھے اپنا کام نکالنے کہ ہیکڑی دکھانے۔ عاجزی سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ڈینگ مارنے سے نہیں نکلتا۔ نایک رام نے تو لاٹھی کندھے پر رکھی اور چلے۔ بجرنگی نے کہا کہ میں ذرا جانوروں کو دیکھنے جاتا ہوں اور ادھر ہی سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ وہ یوں بڑا اکھڑ آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا۔ سارا محلّہ اس کے غصہ سے کانپتا تھا، لیکن وہ قانونی کارروائیوں سے ڈرتا تھا۔ پولیس اور عدالت کے نام ہی سے اس کی جان سوکھ جاتی تھی۔ نایک رام کو روز ہی عدالت سے کام رہتا تھا۔ وہ ان باتوں میں مشاق تھے۔ بجرنگی کو اپنی زندگی میں کبھی گواہی دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ نایک رام کے چلے آنے پر طاہر علی بھی گھر چلے گئے۔ پر بجرنگی وہیں آس پاس ٹہلتا رہا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنا دکھڑا سناؤں۔

طاہر علی کے باپ محکمہ پولیس میں کانسٹیبل سے تھانہ داری کے درجہ تک پہنچے تھے۔ مرتے وقت کوئی جائیداد تو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ ان کی تجہیز و تکفین بھی قرض لے کر کی گئی۔ لیکن طاہر علی کے سر پر دو بیواؤں اور ان کی اولاد کا بار چھوڑ گئے۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے طاہر علی تھے۔ دوسری سے ماہر علی اور ظاہر علی اور تیسری سے جابر علی۔ طاہر علی مستقل مزاج اور عقل مند تھے۔ باپ کی وفات

ہونے پر سال بھر تو وہ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ پھر کہیں مویشی خانہ میں محرری مل گئی۔ کہیں کسی دوا فروش کے ایجنٹ ہو گئے۔ کہیں چنگی گھر کے منشی کا عہدہ مل گیا۔ ادھر کچھ عرصہ سے مسٹر جان سیوک کے یہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ ان کے عادات و اطوار اپنے والد مرحوم سے بالکل نرالے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دل کے صاف تھے۔ حرام کی آمدنی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ ان کی ماں تو وفات پا چکی تھیں مگر دونوں سوتیلی مائیں بقید حیات تھیں۔ طاہر کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بیوی کے علاوہ ایک لڑکا تھا۔ صابر علی اور ایک لڑکی نسیمہ۔ اتنا بڑا خاندان تھا اور صرف تیس روپیہ ماہوار آمدنی۔ اس گرانی کے زمانہ میں جن کہ اس سے پانچ گنا آمدنی میں بھی فراغت سے گزر بسر نہ ہوتی تھی، ان کو سخت تکلیف کرنی پڑتی۔ لیکن نیت فاسد نہ ہوتی تھی۔ خدا کا خوف ان کی خصلت کا خاص جزو تھا۔ گھر میں پہنچے تو ماہر علی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ طاہر اور جابر مٹھائی کے لیے رو رہے تھے اور صابر آنگن میں اچھل اچھل کر باجرہ کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ طاہر علی تخت پر بیٹھ گئے اور دونوں چھوٹے بھائیوں کو گود میں اٹھا کر چپ کرانے لگے۔ ان کی بڑی سوتیلی ماں نے جس کا نام زینب تھا، دروازہ پر کھڑی ہو کر نایک رام اور بجرنگی کی باتیں سنی تھیں۔ بجرنگی دس ہی پانچ قدم چلا تھا کہ ماہر علی نے پکارا۔ ''سنو جی! او آدمی! ذرا یہاں آنا۔ تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔''

بجرنگی لوٹ پڑا۔ کچھ آس بندھی۔ آ کر پھر برآمدہ میں کھڑا ہو گیا۔ زینب ٹاٹ کے پردہ کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ پوچھا۔ ''کیا بات تھی جی؟''

بجرنگی: وہی زمین کی بات چیت تھی۔ صاحب اسے لینے کو کہتے ہیں۔ ہمارا گزر بسر اسی زمین سے ہوتا ہے۔ منشی جی سے کہہ رہا ہوں کسی طرح اس جھگڑے کو مٹا دیجیے۔ نجرنیاج (نذر نیاز) دینے کو بھی تیار رہوں۔ پر منشی جی سنتے ہی نہیں۔

زینب: سنیں گے کیوں نہیں؟ سنہیں گے نا تو غریبوں کی ہائے کس پر پڑے گی؟ تم

بھی تو گنوار آدمی ہو۔ ان سے کیا کہنے گئے؟ ایسی باتیں مردوں سے کہنے کی تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ ہم سے کہتے۔ ہم طے کرا دیتے۔

جابر کی ماں کا نام تھا رقیہ۔ وہ بھی آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں عورتیں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں کے دل و دماغ اور خیالات یکساں تھے۔ ان میں سوکن کا جلاپا نام کو نہ تھا۔ آپس میں بہنوں کی سی محبت تھی۔ بولی۔ ''اور کیا بھلا ایسی باتیں مردوں سے کی جاتی ہیں؟''

بجرنگی: ماتا جی۔ میں گنوار آدمی اس کا حال کیا جانوں۔ اب آپ ہی طے کرا دیجیے۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچے جئیں گے۔

زینب: سچ سچ کہنا۔ یہ معاملہ دب جائے تو کہاں تک دو گے؟

بجرنگی: بیگم صاحب پچاس روپے تک دینے کو تیار ہوں۔

زینب: تم بھی تو غضب کرتے ہو۔ پچاس ہی میں اتنا بڑا کام نکالنا چاہتے ہو۔

رقیہ: (آہستہ سے) بہن! کہیں بدک نہ جائے۔

بجرنگی: کیا کروں بیگم صاحب۔ غریب آدمی ہوں۔ لڑکوں کو جو کچھ حکم ہو گا، دودھ دہی کھلاتا رہوں گا۔ لیکن نگد (نقد) تو اس سے زیادہ میرا کیا نہ ہو گا۔

رقیہ: اچھا تو روپیوں کا انتظام کرو۔ خدا نے چاہا تو سب طے ہو جائے گا۔

زینب: (آہستہ سے) رقیہ! تمہاری جلد بازی سے تو میں عاجز آ گئی۔

بجرنگی: ماں جی! یہ کام ہو گیا تو سارا محلّہ آپ کا جس گائے گا۔

زینب: مگر تم تو پچاس سے آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اتنے تو صاحب ہی دے دیں گے۔ پھر گناہ بے لذت کیوں کیا جائے۔

بجرنگی: ماں جی! آپ سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ دس پانچ روپے اور چٹا دوں گا۔

زینب: تو کب تک روپے آ جائیں گے؟

بجرنگی: بس دو دن کی مہلت مل جائے۔ تب تک منشی جی سے کہہ دیجیے صاحب سے

کہیں سنیں۔

زینب: واہ مہتو! تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ مفت ہی میں کام نکالنا چاہتے ہو۔ پہلے روپے لاؤ پھر تمہارا کام نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔

بجرنگی دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے خوش خوش چلا گیا، تو زینب نے رقیہ سے کہا۔ ''تم بے صبر ہو جاتی ہو۔ ابھی چماروں سے دو پیسے فی کھال لینے پر تیار ہو گئیں۔ میں دو آنے لیتی اور وہ خوشی سے دیتے۔ یہی اہیر پورے سو گن کر جاتا۔ بے صبری سے غرض مند چوکنا ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ شاید ہم کو بے وقوف بنا رہی ہیں۔ جتنی ہی دیر لگاؤ۔ جتنی ہی بے رخی سے کام لو اتنا ہی اعتبار بڑھتا ہے۔''

رقیہ: کیا کروں بہن! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں بہت سختی سے نشانہ خطا نہ کر جائے۔

زینب: وہ اہیر روپے ضرور لائے گا۔ طاہر کو آج ہی سے بھرنا شروع کر دو۔ بس عذاب کا خوف دلانا چاہیے۔ انہیں ہتھے چڑھانے کا یہی ڈھنگ ہے۔

رقیہ: اور کہیں صاحب نہ مانیں تو؟

زینب: تو کون ہمارے اوپر کوئی نالش کرنے جاتا ہے؟

طاہر علی کھانا کھا کر لیٹے تھے کہ زینب نے جا کر کہا۔ ''صاحب دوسروں کی زمین کیوں لیے لیتے ہیں؟ بے چارے روتے پھرتے ہیں۔''

طاہر: مفت تھوڑا ہی لینا چاہتے ہیں۔ اس کا معقول معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔

زینب: یہ تو غریبوں پر ظلم ہے۔

رقیہ: ظلم ہی نہیں ہے۔ عذاب ہے۔ بھیا تم صاحب سے صاف صاف کہہ دو۔ مجھے اس عذاب میں نہ ڈالیے۔ خدا نے میرے آگے بھی بال بچے دیئے ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ میں یہ عذاب سر پر نہ لوں گا۔

زینب: گنوار تو ہیں ہی۔ تمہارے ہی سر ہو جائیں۔ تمہیں صاف کہہ دینا چاہیے کہ میں محلّہ والوں سے دشمنی نہ مول لوں گا۔ جان جوکھم کی بات ہے۔

رقیہ: جان جوکھم تو ہے ہی۔ یہ گنوار کسی کے نہیں ہوتے۔

طاہر: کیا آپ نے بھی کچھ افواہ سنی ہے؟

رقیہ: ہاں۔ یہ سب چمار آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ صاحب نے زمین لی تو خون کی ندی بہہ جائے گی۔ میں نے تو جب سے سنا ہے، ہوش اڑے ہوئے ہیں۔

زینب: ہوش اڑنے کی بات ہی ہے۔

طاہر: مجھے وہ سب ناحق بدنام کر رہے ہیں۔ میں لینے میں نہ دینے میں۔ صاحب نے اس اندھے سے زمین کے بارے میں بات چیت کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی جو میرا فرض تھا، لیکن یہ احمق یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ہی صاحب کو اس زمین کی خریداری پر آمادہ کیا ہے۔ حالانکہ خدا جانتا ہے۔ میں نے کبھی ان سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

زینب: مجھے بدنامی کا خوف تو نہیں ہے۔ ہاں خدا کے قہر سے ڈرتی ہوں۔ بے کسوں کی آہ کیوں سر پر لو؟

طاہر: میرے اوپر کیوں عذاب پڑنے لگا؟

زینب: اور کس کے اوپر پڑے گا۔ بیٹا! یہاں تو تمہیں ہو۔ صاحب تو نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ تو بھس میں آگ لگا کر دور سے تماشا دیکھیں گے۔ آئی گئی تو تمہارے سر جائے گی۔ اس پر قبضہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ مقدمے چلیں گے تو پیروی تمہیں کرنی پڑے گی۔ نا بھیا! میں اس آگ میں نہیں کودنا چاہتی۔

رقیہ: میرے میکے میں ایک کارندہ نے کسی کاشتکار کی زمین نکال لی تھی۔ دوسرے ہی دن جوان بیٹا اٹھ گیا۔ کیا اس نے زمیندار ہی کے حکم سے، مگر بلا آئی اس غریب کے سر۔ دولت مندوں پر عذاب بھی نہیں پڑتا۔ اس کا وار بھی غریبوں ہی پر ہوتا ہے۔ ہمارے بچے روز ہی نظر اور آسیب کی جھپٹ میں آتے رہتے ہیں۔ پر آج

تک کبھی نہیں سنا کہ کسی انگریز کے بچہ کو نظر لگی ہو۔ ان پر بلاؤں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

یہ پتہ کی بات تھی۔ طاہر علی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ ان کے گھر کے سبھی بچے گنڈے اور تعویذوں سے مڑھے ہوئے تھے۔ اس پر بھی آئے دن جھاڑ پھونک اور رائی نمک کی ضرورت پڑا ہی کرتی تھی۔

مذہب بالخصوص خوف پر مبنی ہے۔ خوف کو دور کر دیجیے۔ پھر آپ کی تیرتھ جاترا۔ پوجا پاٹ۔ اشنان دھیان۔ روزہ نماز کسی کا نشان بھی نہ رہے گا۔ مسجدیں خالی نظر آئیں گی اور مندر ویران!

طاہر علی کو خوف نے مغلوب کر دیا۔ آقا کی خدمت گزاری یا فرض شناسی کا خیال قہر ایزدی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

(5)

چتاری کے راجہ مہندر کمار سنگھ اپنے عین عالم شباب ہی میں اپنی کارگزاری اور خاندانی شرافت کے سبب میونسپلٹی کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر کام کرنا ان کے چال چلن کا خاصہ تھا۔ رئیسوں کی عیش پسندی اور نمود طلبی کا ان کے مزاج میں شائبہ بھی نہ تھا۔ بہت ہی سادہ لباس پہنتے تھے اور ٹھاٹ باٹ سے نفرت کرتے تھے۔ شوق تو ان کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ گھڑ دوڑ، بائیسکوپ، تھیٹر، رقص و سرود، سیر و شکار، شطرنج یا تاش سے ان کو ذرا بھی مس نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ رغبت تھی تو باغبانی سے۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتے تھے۔ باقی وقت شہر کے معائنہ اور میونسپلٹی کے کاموں کی انجام دہی میں صرف کرتے تھے۔ حکام سے وہ بلا ضرورت بہت کم ملتے تھے۔ ان کے دور انتظام میں شہر کے محض انہیں حصوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی جہاں حکام کے بنگلے تھے۔ شہر کی تاریک گلیوں اور تعفن خیز بدروؤں کی صفائی وسیع سڑکوں اور دلکش فضاؤں کی صفائی سے کم ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر حکام ان سے کشیدہ رہتے تھے۔ انہیں فریبی اور مغرور

خیال کرتے تھے لیکن شہر کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی ان سے غرور یا بے رخی کی شکایت نہ تھی۔ ہر وقت ہر شخص سے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ ضابطہ کی خلاف ورزی کے لیے انہیں عوام پر جرمانہ کرنے یا مقدمہ چلانے کی بہت ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ان کا اثر و اخلاق سخت طریقۂ عمل کو دبائے رکھتا تھا۔ وہ انتہا درجہ کے کم سخن تھے۔ کبرسنی کی خاموشی خیالات کی پختگی کی دلیل ہے اور عالم شباب کی خاموشی ان کی مسرت کی، لیکن راجہ صاحب کی کم گوئی اس بات کو غلط ثابت کرتی تھی۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی تھی، اس میں غور و خوض کی کافی جھلک ہوتی تھی۔ ایک با ثروت تعلقہ دار ہونے پر بھی ان کی طبیعت کا میلان جمہوریت کی جانب تھا۔ ممکن ہے یہ ان کے سیاسی اصولوں کا نتیجہ ہو کیونکہ ان کی تعلیم، ان کا اقتدار، ان کے گرد و پیش کے حالات، ان کا مفاد۔ سب اس میلان کے ناموافق تھے مگر ضبط اور مشق نے اب اس کو ان کے خیالی دائرہ سے نکال کر ان کی فطرت میں داخل کر دیا تھا۔ شہر کے انتخابی حلقوں کی درستی میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس لیے شہر کے اکثر روساء ان سے بدظن رہا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں راجہ صاحب کی جمہوریت پرستی صرف ان کے عہدہ کو قائم و برقرار رکھنے کا ذریعہ تھی۔ وہ عرصہ تک اپنی اس عزت کی جگہ پر متمکن رہنے کے لیے یہ خودنمائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اخباروں میں بھی کبھی کبھی اس پر نوٹ شائع ہوتے رہتے تھے، لیکن راجہ صاحب اس کی تردید کے لیے عقل اور وقت کا بیجا تصرف نہ کرتے تھے۔ نیک نام بننا ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ پر وہ خوب جانتے تھے کہ اس اونچے درجہ پر پہنچنے کے لیے عوام کی بے غرضانہ خدمت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ راجہ صاحب اشنان دھیان سے فارغ ہو کر شہر کے معائنہ کے لیے جا رہے تھے کہ اتنے میں مسٹر جان سیوک کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ جان سیوک کا حکام سے زیادہ ربط ضبط تھا۔ ان کے سگریٹ کمپنی کے حصہ دار بھی زیادہ تر حکام ہی تھے۔

راجہ صاحب نے کمپنی کا پراسپیکٹس دیکھا تھا مگر جان سیوک سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے وہ بدگمانی تھی جس کی بنیاد افواہوں پر ہوتی ہے۔ راجہ صاحب کل اندو سے ملنے کے لیے گئے تھے۔ وہاں صوفیہ سے ان کی ملاقات ہوگئی تھی۔ اسی وقت جان سیوک کا بھی کچھ ذکر آ گیا تھا۔ اس وقت سے مسٹر سیوک کے متعلق ان کے خیالات میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ کارڈ پاتے ہی باہر نکل آئے اور جان سیوک سے ہاتھ ملا کر ان کو اپنے دیوان خانہ میں لے گئے۔ جان سیوک کو یہ کسی فقیر کی کٹی کی طرح معلوم ہوا جہاں سجاوٹ کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ چند کرسیوں اور ایک میز کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ ہاں کاغذات و اخبارات کا ایک ڈھیر میز پر بے ترتیبی کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔

ہم کسی سے ملتے ہی اپنی قیاسی عقل سے معلوم کر لیتے ہیں کہ ہماری نسبت اس کا کیا خیال ہے۔ مسٹر سیوک کو ایک لمحہ تک زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تمہید کا کوئی مناسب پہلو نہ سوجھتا تھا۔ اس بحر بے پایاں کو پار کرنے کے لیے ایک زمین سے اور دوسرا آسمان سے مدد مانگ رہا تھا۔ راجہ صاحب کو تمہید تو سوجھ گئی تھی۔ (صوفی کے اعلیٰ ایثار اور خدمت کے بیان سے بڑھ کر اور کون سی تمہید ہوتی؟) مگر بعض اشخاص کو اپنی تعریف سننے سے جس قدر گریز ہوتا ہے، اتنا ہی کسی دوسرے کی تعریف کرنے سے ہوتا ہے۔ جان سیوک میں یہ بات نہ تھی۔ وہ تعریف یا غیبت دونوں ہی کر سکتے تھے۔ یکساں کمال کے ساتھ بولے۔ ''آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا لیکن تعارف نہ ہونے کے سبب حاضر نہ ہو سکتا تھا اور صاف بات تو یہ ہے (مسکرا کر) آپ کے بارے میں حکام کے منہ سے ایسی ایسی باتیں سنتا تھا جو میری خواہش کو عمل میں منتقل نہ ہونے دیتی تھیں مگر آپ نے انتخابی طریقوں کو آسان بنا کر جس حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے، ان سے حاکموں کے جھوٹے اعتراضات کی قلعی کھول دی ہے۔''

حکام کے بیجا اعتراضات کا تذکرہ کر کے جان سیوک نے اپنی زبان کی صفائی ثابت کر دی۔ راجہ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ آسان کوئی تدبیر نہ تھی۔ راجہ کو حکام سے یہی شکایت تھی۔ اسی سبب سے ان کے انتظامات میں مشکلیں آ پڑتی تھیں۔ تاخیر ہو جاتی تھی اور رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ بولے۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ حکام مجھ سے اس قدر بدظن رہتے ہیں۔ میری اگر کوئی خطا ہے تو اتنی ہی کہ میں عوام کے لیے بھی صحت اور سہولت کی اتنی ہی ضرورت سمجھتا ہوں جتنی حکام اور رؤسا کے لیے۔''

مسٹر سیوک: جناب! ان لوگوں کے دماغ کی کچھ نہ پوچھیے۔ دنیا ان کی آسائش کے لیے ہے اور کسی کو اس میں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ جو شخص ان کے آستانے پر جبین سائی نہ کرے، وہ نااہل، نامہذب اور باغی ہے اور جو شخص قومیت کا ذرا بھی احساس رکھتا ہو۔ بالخصوص جو جہاں کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہتا ہو، وہ بلاشبہ قابل تعزیز اور گردن زدنی ہے۔ حب الوطنی ان کی نگاہ میں بدترین گناہ ہے۔ آپ نے میرے سگریٹ کے کارخانہ کا دستور العمل ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

مہندر: جی ہاں دیکھا تھا۔

جان سیوک: پراسکپٹس کا نکلنا تھا کہ حکام کی نگاہیں مجھ سے یک دم پھر گئیں۔ مجھ پر ان کی نوازش تھی۔ اکثر حکام سے میری دوستی تھی مگر اسی روز سے میں ان کی برادری سے خارج کر دیا گیا۔ میرا حقہ پانی بند ہو گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی رؤساء اور حکام نے بھی آنا کانی شروع کر دی۔ اب میں ان لوگوں کی نگاہوں میں شیطان سے بھی زیادہ مکروہ ہوں۔

اتنی طولانی تمہید کے بعد جان سیوک اپنے مطلب پر آئے۔ بہت کچھ ہچکتے ہوئے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ راجہ صاحب قیافہ شناس تھے۔ پیران پارسا کو خوب پہچانتے تھے۔ انہیں مغالطہ دینا آسان نہ تھا، لیکن موقع ایسا آ پڑا تھا کہ اپنے اصولوں کی حفاظت

کے لیے تجاہل سے کام لینا پڑا۔ کسی دوسرے موقع پر وہ اس تجویز کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیتے۔ ایک غریب بیکس اندھے کی زمین کو جو اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہو، اس کے قبضہ سے نکال کر ایک سرمایہ دار کو دے دینا ان کے اصول کے منافی تھا، لیکن آج اول مرتبہ انہیں اپنے اصول کو طاق پر رکھ دینا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مس صوفیہ نے ان کے ایک قریبی رشتہ دار کی جان بچائی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جان سیوک کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا کنور بھرت سنگھ کو احسان کے بھاری بوجھ سے سبکدوش کر دینا ہوگا۔ وہ اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ احسان مندی ہم سے وہ سب کچھ کرا لیتی ہے جو اصولی نقطۂ خیال سے مذموم و قابل تحقیر ہے۔ یہ وہ چکی ہے جو ہمارے اصولوں اور قاعدوں کو پیس ڈالتی ہے۔ آدمی جتنا بے لوث ہوتا ہے، اس کے لیے احسان کا بار اتنا ہی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب نے اس معاملہ کو جان سیوک کے حسب منشاء طے کر دینے کا وعدہ کیا اور مسٹر سیوک اپنی کامیابی پر پھولے ہوئے گھر آئے۔

بیوی نے پوچھا: ''کیا طے کر آئے؟''

جان سیوک: وہی جو طے کرنے گیا تھا۔

بیوی: شکر ہے۔ مجھے امید نہ تھی۔

جان سیوک: یہ سب صوفی کے احسان کی برکت ہے۔ یہ اسی کے ایثار کی طاقت ہے جس نے مہندر کمار جیسے مغرور اور بے مروت آدمی کو نیچا دکھا دیا۔ ایسے تپاک سے ملے گویا میں ان کا پرانا دوست تھا۔ یہ مسئلہ واقعی ناقابل حل تھا اور اس کے حل کے لیے میں صوفی کا مرہون منت ہوں۔

مسز سیوک: (ترش رو ہو کر) تو تم جا کر اسے بلوا لاؤ۔ میں نے منع تو نہیں کیا ہے۔ مجھے ایسی باتیں بار بار کیوں سناتے ہو؟ میں تو اگر پیاسی مرتی بھی ہوں گی تو اس سے پانی نہ مانگوں گی۔ مجھے للو چپو نہیں آتی۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر بھی۔ اگر وہ خدا

سے منحرف ہو کر اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے تو میں بھی اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے کیوں اس کی خوشامد کروں؟

پربھو سیوک روزانہ ایک بار صوفیہ سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کنور صاحب اور ونے دونوں کی منکسر مزاجی اور شرافت نے اس کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ کنور صاحب جوہر شناس تھے۔ انہوں نے اول ہی روز ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا تھا کہ یہ نوجوان معمولی دل و دماغ والا نہیں ہے۔ ان پر یہ بات بھی مخفی نہ رہی کہ اس کا فطرتی میلان ادب اور فلسفہ کی طرف ہے۔ تجارتی کاروبار سے اسے اتنی مناسبت ہے جتنی ونے کو زمینداری سے، اس لیے وہ پربھو سیوک سے بالعموم ادب اور فلسفہ پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس کے فطرتی رجحان کو قومیت کے جذبات سے معمور کر دینا چاہتے تھے۔ پربھو سیوک کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص فن شاعری کا ماہر ہے۔ ان سے انہیں وہ انس ہو گیا تھا جو شعرا کو اصحاب ذوق سے ہوا کرتا ہے۔ اس نے انہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں۔ ان کی فیاضانہ داد دہی سے اس پر ایک نشہ سا چڑھا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت شاعری کے خیال میں محو رہتا۔ وہ شک اور مایوسی جو عموماً نو مشق ادیبوں کو اپنے کلام کی اشاعت اور قبولیت کے بابت ہوا کرتی ہے، کنور صاحب کی ہمت افزائیوں کے باعث یقین اور حوصلہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہی پربھو سیوک جو ہفتوں تک قلم نہ اٹھاتا تھا، اب ایک ایک دن میں کئی کئی نظمیں لکھ ڈالتا۔ اس کے خیالات میں دریا کی سی روانی اور فراوانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جان سیوک کو آتے دیکھ کر وہاں گیا کہ دیکھوں کیا خبر لائے ہیں؟ زمین کے ملنے پر جو رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں، ان سے اسے امید ہو گئی تھی کہ غالباً کچھ دنوں تک اس بندش میں نہ پڑوں۔ جان سیوک کی کامیابی نے اس امید کو منقطع کر دیا۔ دل کی اس حالت میں ماں کے آخری الفاظ اسے نہایت ناگوار معلوم ہوئے، بولا۔ ”ماما۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ صوفی وہاں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اکتا کر خود

بخود چلی آئے گی تو آپ غلطی پر ہیں۔ صوفی وہاں اگر برسوں رہے تو بھی وہ لوگ اس کا گلا نہ چھوڑیں گے۔ میں نے ایسے سیر چشم اور خلیق آدمی نہیں دیکھے۔ ہاں صوفی کی ہمت یہ گوارا نہ کرے گی کہ وہ عرصہ تک ان کی مہمان نوازی سے مستفیض ہوتی رہے۔ ان دو ہفتوں میں وہ جتنی کمزور ہوگئی ہے، اتنی مہینوں بیمار رہ کر بھی نہ ہوسکتی تھی۔ اسے تمام دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن جس طرح کسی سرد ملک کا پودا گرم ملک میں آ کر ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی روز بروز سوکھتا ہی جاتا ہے، وہی حالت اس کی بھی ہوگئی ہے۔ اس کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہاں جاؤں، کیا کروں۔ اگر آپ نے اس کو وہاں سے جلد ہی نہ بلالیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ وہ آج کل بدھ اور جین مذہب کی کتابیں دیکھا کرتی ہے اور مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔"

جان سیوک: تم تو روز وہاں جاتے ہو۔ کیوں اپنے ساتھ نہیں لاتے؟

مسز سیوک: مجھے اس کا اندیشہ نہیں ہے۔ یسوع کا دشمن میرے یہاں جگہ نہیں پا سکتا۔

پربھو سیوک: گر جانہ جانا ہی اگر یسوع کا دشمن ہونا ہے تو لیجیے آج سے میں بھی گرجا نہ جاؤں گا۔ نکال دیجیے مجھے بھی گھر سے۔

مسز سیوک: (روکر) تو یہاں میرا ہی کیا رکھا ہے؟ اگر میں ہی بس کی گانٹھ ہوں تو میں ہی منہ پر سیاہی لگا کر کیوں نہ نکل جاؤں؟ تم اور صوفی آرام سے رہو۔ میرا بھی خدا مالک ہے۔

جان سیوک: پربھو! تم میرے سامنے اپنی ماں کی تحقیر نہیں کر سکتے۔

پربھو سیوک: خدا نہ کرے میں اپنی ماں کی تحقیر کروں، لیکن میں دکھاوا والے مذہب کے لیے اپنی روح پر یہ جبر نہ ہونے دوں گا۔ آپ لوگوں کی ناراضی کے خوف سے اب تک میں نے اس بارے میں کبھی زبان نہیں ہلائی، لیکن جب یہ دیکھتا